تفسیر سورۃ فاتحہ

(مولانا عبدالحی فاروقی)

(۲)

مالک یوم الدین: بدلہ اور مکافات کے لیے عربی زبان میں دین کا لفظ آتا ہے مشہور ضرب المثل ہے: کما تدین تدان، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، ایک شاعر کہتا ہے:

فلما صرح الشر وامسی وھو عریان
ولم یبق سوی اللہ وان دنا ھم کما دانوا

اسی بنا پر یوم الدین کے معنی بدلہ کا دن ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ انسان جو کچھ کرے، اس کا بدلہ ضرور مل کر رہے، دنیا بھی دار الجزا ضرور ہے مگر اس کی محدودیت کی بنا پر بدلہ پورا نہیں مل سکتا، اور بعض اوقات ایسے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ مجرم سزا سے بالکل بچ نکلتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ کوئی دن ایسا مقرر ہو جس میں ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل کر رہے، اور یہ وہ دن ہو گا جس روز اللہ کے سوا اور کسی کی حکومت نہ ہو گی:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰:۱۶) آج کس کی بادشاہت ہے؟ خدا کی، جو اکیلا اور غالب ہے

دوسری جگہ فرمایا:

وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲:۱۹) اور حکم اس روز خدا ہی کا ہو گا۔

باہمی ربط: انسان اگر اپنی زندگی کی مختلف منزلوں پر غور کرے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ ہر قدم پر اس کو خدائے قدوس کی دست گیری و اعانت کی ضرورت ہے۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو بالکل بے یار و مددگار ہوتا ہے اس وقت اللہ کی صفت ربوبیت آگے بڑھتی ہے، اور اس کی یاری و مددگاری میں لگ جاتی ہے، اب وہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے، اس کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں، اور اتمام و تکمیل کی طرف

قدم بڑھاتی ہیں، اس تمام تگ ودو میں الرحمٰن اور الرحیم اس کی حفظ و نگہداشت کرتے ہیں اور اس کے نشو و ارتقا میں زمین و آسمان کے ایک ایک ذرے کو اس کا مطیع و فرماں بردار بنا دیتے ہیں۔

لیکن اس فوز و کامرانی پر اسے اترا کر غرور و استکبار میں خدا کا انکار نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ ابھی ایک منزل اس کے لیے اور بھی ہے، جس میں اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ وہ آنے والی زندگی بھی خدائے قدوس ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پس اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ ہی اس کا رب، اس کو نشو و نما دینے والا ہے، اور اس کے ہر کام کا بدلہ دینے والا ہے، اس لیے وہ کسی حالت میں بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

جب ایک انسان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہی میرا رب ہے، اسی کی صفت رحمت ہر طرف سے میرا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور وہی میرے کاموں کا بدلہ دینے والا ہے تو اب ظاہر ہے کہ وہ اسی کے آگے سر جھکائے گا، اسی کا اپنے آپ کو غلام سمجھے گا، اس کا دست سوال دراز ہوگا تو اسی کے سامنے اس لیے وہ پکار کر کہتا ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہم تیرے ہی غلام ہیں، یہی غلامی ہمارے لیے موجبِ افتخار و ناز ہے، ہم کہاں جائیں، تیرے ہی آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں کہ تیرے سوا ہمارا کوئی مونس و غمخوار اور یار و مددگار نہیں، دوسری جگہ آتا ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (۹۸: ۵)

اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، اور ایک ہو ہو کر۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ، (۲: ۱۶۵)

لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا ہی سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔

اس زمین کی تمام کائنات اسی ایک کے قبضہ و اختیار میں ہے، اور جب ایک شخص اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اسی کا غلام ہے تو اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو وہ اسی کے آگے ہاتھ پھیلائے گا

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ، وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔

اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے، اور وہ مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا، اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا

وہی ہر چیز دیتا ہے:

یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا۔

جسے چاہتا ہے، بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے یا ان کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے

صِرَاطُ مُّسْتَقِیْمُ غلام کو برابر اس بات کی فکر رہتی ہے کہ وہ اپنے آقا کو ہمیشہ خوش رکھے، اس کی مرضی کی تلاش میں رہے، اور اس بات کی ٹوہ میں رہے کہ وہ اس سے ناراض نہ ہونے پائے، مگر وہ جانتا ہے کہ اس کی عقل محدود اور علم بہت کم ہے، وہ اپنے غور و فکر سے یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اس کا مالک کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس چیز کو ناپسند کرتا ہے، اس لیے وہ والہانہ و مضطربانہ اسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ ہمیں سیدھی راہ بتا دیجیے۔

راستہ دکھانے کو ہدایت کہتے ہیں، جس پر چل کر انسان اپنے مطلوب تک پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ نے مختلف مرتبوں سے ہدایت فرمائی ہے۔

(۱) فطری الہام:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی، (۲۰: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راہ دکھائی،

یہ الہام ہر چیز کو ہوتا ہے، بچہ پیدا ہوتے ہی اسی الہام کی بنا پر ماں کی چھاتی کو اپنے منہ میں لیتا ہے۔

(۲) حواس کے ذریعہ، حواس کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی۔ ظاہری حواس تو اس شعر میں بیان کیے گئے ہیں:

که دارد پنج قوت حس است
شم و ذوق و سماع و لمس و بصر

اور باطنی یہ ہیں: حس مشترک، خیال و وہم، قوتِ حافظہ اور قوتِ متصرفہ، ان سے وہ ہدایت پاتا ہے۔

(۳) عقل، قرآن پاک میں آتا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰:۱۰) — اور اس کو خیر و شر کے دونوں رستے بھی دکھا دیئے

دوسری جگہ ہے:

فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱:۱۷) — ان کو ہم نے سیدھا رستہ دکھایا تھا، مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھا رہنا پسند کیا۔

اسی طرح بھی ارشاد ہوتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱:۸) — پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی

(۴) دین، ہدایت و راہ نمائی کے جس قدر ذرائع اوپر ذکر کیے گئے ہیں، ان میں غلطی کا امکان ہے، یہ جس قدر اختلافات و منازعات باہمی ہیں، وہ سب اسی غلط فہمی کے نتائج ہیں، اور یہ اس درجہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، اسی بنا پر انسان محتاج ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر سے ہدایت کا طلبگار ہو، اس سے صراطِ مستقیم کی دعا کرے۔

صراطِ مستقیم سے مراد وہ رستہ ہے جس پر انسان چل کر دنیا اور آخرت کی سعادتوں اور کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہو:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲:۵۲) — اور بے شک اے محمد! تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔

دوسری جگہ یوں آتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۳:۷۳) — اور تم ان کو سیدھے رستے کی طرف بلاتے ہو۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ — اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (۶: ۵۳) اور رستوں پر نہ چلنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراطِ مستقیم کی حقیقت کو نہایت ہی دل نشیں انداز میں یوں فرمایا ہے:

من عبد اللہ بن عمر قال خطّ لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطًا، ثم قال ھٰذا سبیل اللہ، ثم خط خطوطا عن یمینہ وشمالہ وقال ھٰذہ سُبُل علیٰ کل سبیلٍ منھا شیطانٌ یدعو الیہ، وقرأ اِنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ۔

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچ کر فرمایا، یہ تو اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے، اور فرمایا یہ راستے ہیں، ان میں سے ہر ایک پر شیطان بیٹھا ہے اور اس کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی، ان ھٰذا صراطی مستقیما فاتبعوہ

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اور ان کے درمیان جو فاصلہ ہوگا وہ کم سے کم ہوگا، پس صراطِ مستقیم وہ راستہ ہوگا جو افراط و تفریط سے پاک ہو، دشوار گزار نہ ہو، ایسا مضبوط کہ اس پر سے پھسلنے کا اندیشہ نہ ہو، اس قدر صاف اور روشن ہو کہ اس کی رات بھی دن کے برابر ہو، کہیں کجی اور موڑ نہ ہو، اب اس کا نام کتاب اللہ رکھ لیجیے، اسلام کہیے دین پکاریے، سب ایک ہی چیز ہے۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

انسانی زندگی کا حال یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے طرح طرح کے عوارض میں گھری ہوئی ہے، قدم قدم پر اس کے لیے ٹھوکریں اور گڑھے ہیں، اس کے اردگرد اندھیرا ہی اندھیرا اور تاریکی ہی تاریکی ہے، خارجی اثرات ہیں، ماحول کی گمراہیاں ہیں، خاندانی امیال و عواطف اور رسوم و عوائد ہیں، صحبت و ہم نشینی ہے، جو اندر ہی اندر اپنی تاثیر رکھتی ہے، پھر شیطان ہے جو ہر لمحہ و ہر آن شہوات و مکروہات کی دعوت دیتا ہے، قعرِ دریا میں تختہ بند یاں ہیں، اور حکم یہ ہے کہ دامن تر نہ ہونے پائے، ان حالات و واقعات میں ہر وقت پھسلنے اور ڈگمگانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے، اس لیے عاجز و درماندہ

انسان بے بس ہو کر ہر وقت خدائے حق نواز سے درخواست کرتا ہے: اھدنا الصراط المستقیم، جب بھی وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی سب سے بڑی پکار یہی ہے کہ صرف تیری ہی دست گیری مجھے ان مصیبتوں سے نجات دے سکتی ہے، اور راہ حق پر چلا سکتی ہے، وہ کہتا ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (۳: ۸)

اے پروردگار، جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر، اور ہمیں اپنی رحمت سے نواز، تو تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔

انعام یافتہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب تک کوئی نمونہ موجود نہ ہو، انسان آگے نہیں بڑھ سکتا، اس لیے جب اس نے صراطِ مستقیم کی طلب کی تو اس کے لیے نمونہ ہونا ضروری تھا تاکہ اسے چلنے میں دقت نہ ہو، پس وہ راستہ جس پر چل کر انسان دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے، وہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارشیں ہمیشہ نازل کی ہیں، جو کبھی گم راہ نہ ہوئے اور جن پر کبھی اللہ کا غضب نازل نہ ہوا۔

یہ انعام یافتہ گروہ کون ہے، قرآن اس کی تفسیر خود کرتا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (۴: ۶۵)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں پس وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا، یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک لوگ۔ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔

اس آیت میں چار قسم کے لوگ بیان کیے گئے ہیں جن میں اللہ کا انعام ہوتا ہے:

(۱) نبی، اس ذاتِ قدسی میں دو قوتیں موجود ہوتی ہیں:

(الف) قوتِ نظری، اس قوت سے وہ اشیاء کی ماہیت معلوم کرتا ہے، روح القدس کی تائید اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی بنا پر کسی حقیقت میں بھی اسے کسی امر کے لیے شک و اشتباہ نہیں ہوتا۔

(ب) قوتِ عملی، اس میں ایسا ملکۂ صالحہ راسخ ہوتا ہے کہ وہ ہر نیک کام کو دلی رغبت اور شوق سے کرتا ہے اور ہر بُرے کام سے اسے بالطبع نفرت ہوتی ہے۔

ان دونوں میں وہ درجۂ کمال پر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا انسان باوجود انتہائی مجاہدہ و ریاضت کے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، وہ اپنی قوم میں اس طرح زندگی بسر کرتا ہے کہ ہر شخص اس کی ایک ایک نقل و حرکت سے واقف ہوتا ہے، اس کے صالح اور امین ہونے کا بانگِ دہل اقرار کرتا ہے۔ اسی بنا پر وہ پوچھتا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ (۱۰: ۱۶)

میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں، بھلا تم سمجھتے نہیں۔

۲۔ صدیق، نبی کی وہ دونوں قوتیں اب تقسیم ہو جاتی ہیں، قوتِ نظریہ بدرجہ اتم صدیق میں موجود ہوتی ہے، اسے حق و صداقت کے پہچاننے کے لیے کسی خارجی دلیل و معجزہ کی ضرورت نہیں ہوتی؛ وہ اپنے وجدانِ صحیح اور فطری صلاحیت کی بنا پر حق کو فوراً شناخت کر لیتا ہے، اور اس کے آگے سرِ نیاز خم کر دیتا ہے، وہ ایمان و یقین کا پیکرِ مجسم، اور عزم و استقامت کا پہاڑ ہوتا ہے، اخلاص و ایثار میں بے نظیر، امانت و دیانت میں بے مثال، صداقت و راست بازی میں یکتا، اور توکل و اعتماد علی اللہ میں اپنی نظیر آپ ہوتا ہے۔ اس کی نظر دنیاوی اسباب و وسائل پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ راہِ حق میں انبیاء کرام کے دوش بدوش چلتا ہے۔

۳۔ شہید، یہ عمل کا مکمل نمونہ ہوتا ہے، وہ اپنی زبان اور اعضاء و جوارح سے حق کی شہادت دیتا ہے، اس کے تمام اعمال، اس کی تمام حرکات، اس کا اٹھنا اور بیٹھنا، اس کی دشمنی اور محبت، اور اس کی زندگی اور موت، سب اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے اور اس حیثیت سے تعلیمِ الٰہی کا علمبردار ہوتا ہے۔

۴۔ صالح، صدیق و شہید میں جو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں، وہی اس میں بھی موجود ہیں، مگر ان سے کم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا طغرائے امتیاز ہوتا ہے۔

قرآن کا انصاف اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں چار قسم کے لوگ بیان کیے گئے، ان میں کسی قوم اور ملک کی خاص

نہیں کیا گیا، دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اللہ کی تعلیم نہ آئی ہو، اور یہ ارباب صلاح و تقویٰ نہ پیدا ہوئے ہوں پس یہ خصوصیت صرف قرآن کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کے صالح افراد کو جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی ہے، انعام یافتہ گروہ میں شامل کرتا، ان کی پیروی کی دعوت دیتا، اور ان کو دوسروں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۶: ۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی، تو تم انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔

ایک جگہ فرمایا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا (۱۹: ۵۸)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے پیغمبروں میں سے فضل کیا یعنی، اولادِ آدم میں سے، اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا، اور ابراہیم اور یعقوب کی اولاد میں سے، اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی، اور برگزیدہ کیا۔

مغضوب اور ضالّ جن لوگوں کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ اللہ کے انعام و اکرام سے مالا مال تھے، ان پر نہ تو اللہ کا غضب کبھی نازل ہوا اور نہ راہ حق سے بھٹکے، یہ صراطِ مستقیم کا ثبوت پہلو تھا، اب ان کا منفی پہلو بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قسم کا شک و اشتباہ باقی نہ رہے، انسان کے سامنے جب حق کی راہ کشادہ ہوتی ہے تو تین قسم کے موانع اس کے سامنے آتے ہیں۔

(۱) حجابِ طبع، ہر انسان کی طبیعت میں کھانے پینے کی خواہش موجود ہے۔ خوشی اور غم کے حالات اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں، اب اگر اس نے اپنی تمام زندگی اسی میں ضائع کر دی اور کبھی اسے اخلاقِ صالحہ اور کمالاتِ نافلہ کے حاصل کرنے کا خیال نہ آیا تو اس کے آگے راہ حق واضح نہ ہوگی۔

(۲) حجابِ رسم، لیکن جو شخص دانش مند ہوگا، وہ ضرور اپنے احوال کا جائزہ لے گا، اس میں آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہوگا، اب وہ اپنی طہارت و پاکیزگی کا خیال کرے گا، فضائل و کمالات کے

کسب و حصول میں لگ جائے گا اور ان باتوں میں اس درجہ مستغرق ہو جائے گا کہ دین و ایمان کو بالکل طاقِ نسیاں پر رکھ دیگا، اس میں شک نہیں کہ اپنے ذاتی محاسن کی وجہ سے وہ دنیا میں معزز و محترم رہے گا، مگر جونہی روح اس کے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی وہ اپنے آپ کو درگاہِ رب العزت میں بالکل تہی دست پائے گا اور کوئی چیز اس کے کام نہ آئے گی۔

(۳) حجاب سوءِ معرفت، مگر ان میں جو ذکی الحس ہو گا وہ شریعت کی پابندی اور دلائل و براہین کی بنا پر یہ یقین کرے گا کہ رب السموات والارض ہی تمام کون و مکان میں تدبیر نافذ کرتا ہے وہی سب کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے، اور اسی کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے، اب اس کا دل خالقِ ارض و سماکی محبت سے بھرپور ہو جاتا ہے، اس کے تقرب کا خواہشمند اور اپنی حاجات کی مطلب براری میں اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، مگر اس منزل میں آکر اس سے دو غلطیاں ہو جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں انسانی صفات کا یقین کر لیتا ہے، یا پھر بعض نیک لوگوں میں الوہیت کی صفات مان لیتا ہے، اور یوں راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے۔

یہ حجابات ہیں، جن کی وجہ سے انسان اعمالِ فاسقہ میں مبتلا ہو کر اللہ کے غضب کا مورد بن جاتا ہے اور راہِ صدق و صفا کو چھوڑ کر غلط کاریوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، مغضوب اور ضال سے مراد کیا ہے، مغضوب کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے سیدھا راستہ پہچان لیا، علم و معرفت کی نعمت سے سرفراز ہو گیا، مگر اس نے ہر سچائی کا انکار کیا اور روگردانی کر کے منحرف ہو گیا، ضال اسے کہتے ہیں جو راہ ہی نہ پا سکا، اس لیے ادھر ادھر بھٹکتا رہا، پہلا جاحد ہے اور دوسرا جاہل، اسے حقیقت ہی معلوم نہ ہوئی، اور وہ اپنی جہالت و نادانی پر قانع ہو گیا۔

احادیث و آثار میں آتا ہے کہ مغضوب علیہم یہود ہیں، اور ضالین نصاریٰ یعنی غضب و ضلالت کا شکار یہ قومیں ہوئیں، جن کی تاریخ محفوظ ہے، اس نمونہ کو سامنے رکھ کر دنیا کی تمام قومیں ان سے عبرت اندوز ہوں۔ ان افعالِ فاسقہ سے پرہیز کریں جن کی بنا پر ان کو مردود قرار دیا گیا، اور اس غضب و ضلالت سے بچنے کی پوری کوشش کریں۔ قرآنِ پاک میں جس قدر قصص و حکایات ہیں، وہ حقیقت میں صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ہی کی تشریح و توضیح ہیں۔